

بہ فیض: تاج دار اہل سنت مفتی اعظم علامہ محمد مصطفیٰ رضا نوری علیہ الرحمہ و حضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی
زیر سرپرستی: امین ملت حضرت ڈاکٹر سید محمد امین میاں قادری برکاتی مدظلہ العالی، مارہرہ مطہرہ

یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول

علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی

ناشر: نوری مشن مالگواں

ملنے کا پتا: مدینہ کتاب گھر، اولڈ آگرہ روڈ، مالگواں Cell. 9325028586

سن اشاعت ۱۴۳۷ھ / ۲۰۱۵ء..... ہدیہ: دُعاے خیر

محبت و احترام کے تقاضے

محبت میں بڑی کشش ہے۔ محبت خوبیاں اور نفرت خامیاں تلاش کرتی ہے۔ محبت کشادہ قلبی سے عبارت ہے اور نفرت! تنگ نظری کا باعث ہے۔ محبت کے انداز نزلے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب کریم نے محبوب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جہاں بھی ذکر فرمایا بڑے عمدہ انداز میں اور اعلیٰ و شان دار القاب کے ذریعے۔ یوں ہی محبت رسالت کو ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین (بخاری) میں اسی رمز محبت کی طرف ترغیب ہے۔ محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سکھائی گئی۔ ادب و احترام پر بشارتیں دی گئیں؛ بے ادبی پر وعیدیں سنائی گئیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین محبت رسول میں وارفتہ، فریفتہ اور شیدا تھے، شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ بڑی ذمہ داری سے بات کرتے۔ اس لیے ان کا مقام بھی بڑا بلند و بالا ہے۔ ان کا درس عمل یہی ہے کہ محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان بیان کی جائے۔ اسی درس کی تجدید ہر دور میں ہوتی رہی۔ اکابر و اسلاف نے اسی کا درس دیا، ادب و احترام سکھایا، تعظیم و توقیر بتائی۔ جو احترام و شان کے منکر ہوئے ذلت و رسوائی ان کا نصیب ہوئی۔

ایمان والے کی شان یہ ہے کہ جب شان محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات آئے تو وہ مکمل ہوش اور آداب و احترام کے ساتھ بات کرتے ہیں، قلم چلاتے ہیں۔ آج سمتوں میں تو بہن رسالت کی فضا ہم وار کی جا رہی ہے، مغربی طاقتیں بارگاہ رسالت کے گستاخوں کی مکمل سرپرستی کر رہی ہیں۔ صہیونی میڈیا ناموس رسالت میں جسارت و جرات کا بار بار مظاہرہ کر رہا ہے، کبھی فرضی خاکے بنا کر، کبھی تقدس مآب زندگی پر لایعنی اعتراضات کے ذریعے۔ ان حالات میں ان کے لیے سب سے بڑا سہارا وہ جماعتیں ہیں جو ساری دُنیا میں گستاخی و توہین کا زہر پھیلا رہی ہیں۔ جن کا نظریہ توحید؛ توہین بارگاہ رسالت سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ جن کے لٹریچر اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و عظمت والی باتوں کو شرک و بدعت قرار دیتے نہیں تھکتے۔

علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی (ادارہ صراط مستقیم لاہور) اہل سنت مسلک اعلیٰ حضرت کے داعی ہیں۔ آپ کی دروس و تحریریں محبت و احترام کے جذبات سے لبریز ہیں۔ پیش نظر تحریر ایسی ہی ہے جس میں بارگاہ رسالت کے آداب کے سلسلے میں اہم تفسیری نکات بیان کیے ہیں اور اسلاف کے مسلک حق و صداقت کو اُجاگر کیا ہے۔ ذہن و فکر کی اصلاح کا سامان کیا ہے۔ یہ تحریر فکر انگیز بھی ہے اور ایمان کی تازگی کا سبب بھی، ضروری ہے کہ ایسی تحریروں کو پڑھے لکھے افراد میں عام کیا جائے۔ اور ایسی کتابوں کی اشاعت و بلا قیمت تقسیم کو رواج دیا جائے۔ اللہ کریم! نوری مشن کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور ہمیں فروغ مسلک اعلیٰ حضرت کے لیے سرگرم عمل رکھے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم۔

غلام مصطفیٰ رضوی

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر اس بارے میں ہدایت فرمائی ہے:
اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اءِ اِيْمَانِ وَالْو!

لَا تَقُولُوا رَاعِنَا رَاعِمَانَهُ كَهُو۔

وَقُولُوا انْظُرْنَا اور تم کہو کہ اے محبوب ہم یہ نظر رکھیں۔

وَأَسْمِعُوا

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور کفار کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (سورۃ بقرہ، آیت نمبر ۱۰۴)

قرآن مجید کا یہ مقام بطورِ خاص قیامت تک کے لوگوں کو یہ سمجھا رہا ہے:

لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا

یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پہ نظر کرم فرماؤ۔

شان نزول، پہلی تفسیر: اس آیت کا شان نزول اور اس کی پہلی تفسیر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، رسول اکرم ﷺ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور وہ کہتے:

راعنا یا رسول اللہ ﷺ۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری رعایت رکھیں۔

یعنی آپ قرآن مجید کی آیات پڑھ رہے ہیں۔ تو ہمیں بھی آپ ساتھ لے کر چلیں تاکہ ہم کلمہ لیں، سُن لیں اور یاد کر لیں۔ یہ اُن کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست ہوتی تھی۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اسی لفظ کو نازبا الفاظ کے زمرے میں شمار کیا جاتا اور گالی کے طور پر اس کا استعمال ہوتا۔ جب صحابہ کرام عربی زبان کے لحاظ سے اس کا استعمال کرتے تھے تو صحیح معنی میں کرتے تھے، لیکن یہود کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اپنا بغض اسی لفظ کی آڑ میں ظاہر کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام پر بھی اس لفظ کا بولنا حرام کر دیا اور ارشاد فرمایا:

لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ۖ تَم رَاعِنَاهُ۔

اگرچہ تم تو اچھی نیت سے کہتے ہو لیکن دوسرے لوگ اس لفظ سے بُری سوچ کی گنجائش پیدا کر رہے ہیں، تو جب انہیں اس سے گنجائش ملتی ہے تو تمہارے لیے جائز نہیں۔ تم یہ لفظ بولنا بند کر دو۔

چوں کہ ناموس رسالت کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر کسی لفظ کے دو معنی ہوں؛ ایک معنی درست ہو اور دوسرا معنی شان رسالت کے لائق نہ ہو تو شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس لفظ کا استعمال متروک ہو جائے اور اُس کو چھوڑ دیا جائے تاکہ اس لفظ کی آڑ میں کوئی گستاخ مذموم ارادوں کو پورا نہ کر سکے۔

دوسری تفسیر: صحابہ کرام، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایت کے لحاظ سے ”راعنا“ کہتے تھے لیکن یہود نے اس کو کھینچ کے پڑھنا شروع کر دیا کہ راعینا یعنی راعی چرواہے کو کہتے ہیں۔

صحابہ کرام کہتے: یا رسول اللہ ﷺ راعنا آپ ہمارا لحاظ رکھیے، ہماری رعایت فرمائیے۔ وہ یہ درخواست کرتے تھے لیکن یہود (معاذ اللہ) راعینا کہہ کے اپنی طرف سے بُنّص اور گندی سوچ کا اظہار کرتے تھے۔

راعی غنبا ہماری بکریوں کو چرانے والا

تو معاذ اللہ! جب یہود نے راعنا کہنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام

کے صحابہ کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ: اس لفظ کو بُری سوچ والے استعمال کر رہے ہیں؛ تو تم اس کا استعمال ہی ترک کر دو تا کہ کسی طرح اس کو بول کر رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کا موقع نہ مل سکے۔

تیسری تفسیر: راعنا کو اگر باب مفاعلہ سے مشتق بنائیں تو پھر اس میں جانبین ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ مصافحہ ہے، تو مصافحہ تب بنتا ہے جب دو بندے آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ کے عمل کو مصافحہ نہیں کہا جاسکتا۔ تو جہاں بھی باب مفاعلہ ہوتا ہے وہاں جانبین کا ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ جانبین نہیں ہوں گے تو باب مفاعلہ نہیں بنے گا۔

تو اب راعنا میں باب مفاعلہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جانبین ہیں اور پھر اُن کے آپس میں مساوات سمجھی جا رہی تھی۔ مطلب کیا بنا کہ اے محبوب! آپ ہمارا لحاظ کرو اور ہم آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ یعنی اس لفظ سے یہ معنی نکل سکتا تھا۔ اگرچہ صحابہ کرام کی نیت نہیں تھی۔ لیکن اس میں گنجائش یہ بن رہی تھی اور راعنا باب مفاعلہ سے ہونے کی وجہ سے مساوات کا پہلو نکل رہا تھا کہ آقا اور غلام دونوں برابر ہو رہے ہیں۔

جب کہ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اکرم ﷺ کو انبیاء میں سب سے اونچی شان عطا فرمائی ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس مساوات کی نفی کے لیے جو ایک نبی اور امتی کے درمیان بن رہی تھی، راعنا کہنا ناجائز قرار دیا تا کہ کہیں ایسا تصور بھی پیدا نہ ہو کہ امتی یہ کہے کہ ”میں نبی جیسا ہوں اور نبی میرے جیسے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے اس سوچ کو بند کرنے کے لیے راعنا کا استعمال بھی ناجائز فرما دیا۔ چوتھی تفسیر: جس وقت ایک شخص کسی سے کوئی بات کرنا چاہے تو اُس کے لحاظ سے ایک آرڈر ہے اور ایک التماس ہے۔ جب کہ آرڈر میں اور التماس میں فرق ہے۔ اگرچہ لفظ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں۔ یہ کسی بڑے سے وہ اپنی اپیل کر رہا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ اپنے نوکر سے کہتا ہے کہ تم یہ کام کر دو تو وہ بطور آرڈر کر رہا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ اپیل اور ہوتی ہے اور آرڈر اور ہوتا ہے۔

تو راعنا میں ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے آرڈر والا معنی نکل رہا تھا کہ راعنا ایک امتی بولے اور اس سے اخذ یہ ہو کہ وہ چھوٹا ہو کر بڑی ذات کو حکم دے رہا ہے۔ تو اس صیغہ کے لحاظ سے وہم پیدا ہو رہا تھا۔ اگرچہ بولنے والے صحابہ کرام کی یہ نیت نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کا ادب سکھانے کے لیے اور شان رسالت کے متعلق گفتگو کے آداب بتانے کے لیے اُن پر راعنا کا

بولنا ناجائز قرار دے دیا کہ: اس لفظ کو ہزار بار اچھی نیت سے بولو مگر چوں کہ اس میں وہم پیدا ہو رہا ہے، اس واسطے قیامت تک کے مسلمانوں پر اس کا بولنا حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

پانچویں تفسیر: راعنا کا معنی ہے قولاً راعنا۔ (تفسیر رازی، ۲/۲۴۳)

”کہ رعونت والی بات نہ کرو، یعنی جس بات میں تکبر ہو۔“

اللہ کے پیغمبر سے کوئی اکڑ کر نہ بولے۔ کوئی رعونت سے نہ بولے۔ اس انداز سے نہ بولے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ عاجزی کے سوا بول رہا ہے: لَا تَقُولُوا رَاعِنًا میرے محبوب علیہ السلام سے گفتگو کرتے وقت نرم نرم اور عاجزی کے انداز میں گفتگو کرو اور کوئی شخص تکبر کے انداز میں گفتگو نہ کرے۔ یہ قرآن مجید کی تعلیمات کا اثر ہے کہ؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہوش مند انداز: جس وقت حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سفیر بن کے آئے تھے اور حدیبیہ میں رسول اکرم ﷺ کے پاس صحابہ کو بیٹھ دیکھا تھا تو جن پانچ باتوں سے وہ زیادہ متاثر ہوئے تھے، اُن میں سے ایک بات یہ بیان کی:

إِذَا تَكَلَّمَهُ خَفَضُوا أَصْوَاتَهُمْ۔ (بخاری شریف، باب الشروط فی الجہاد، حدیث نمبر ۲۵۲۹)

جس وقت رسول اکرم ﷺ گفتگو کرتے ہیں تو صحابہ بولتے وقت یہ پابندی ضرور کرتے کہ ہماری آواز نبی علیہ السلام کی آواز کے برابر نہ ہونے پائے۔ ہماری آواز آپ کی آواز سے پست رہے۔ تو یہ آداب رسول اکرم ﷺ کے ہیں، قرآن نے سکھائے ہیں اور صحابہ کرام نے پھر اُن پر عمل کر کے دکھایا ہے۔

یہ نصاب صرف صحابہ کرام کا نہیں تھا بلکہ یہ تابعین کا بھی نصاب تھا اور تبع تابعین کا بھی نصاب تھا، اور بعد کے لوگوں کا بھی نصاب تھا، اور آج کے مسلمانوں کا بھی نصاب ہے، اور یہ قیامت تک کے ایمان والوں کا نصاب ہے۔ اس واسطے اسی آیت کو ہم موضوع بناتے ہوئے آج اپنی گفتگو کو آگے بڑھا رہے ہیں کہ آج ایک انسان جہاں بیٹھ کر کوئی شان رسالت کے متعلق کوئی وضاحت کر رہا ہے کوئی بات اور تبصرہ کر رہا ہے کسی طرح وہ کوئی کلام کر رہا ہے تو اُسے سوچنا چاہیے۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

میں جس دربار کے بارے میں بات کر رہا ہوں وہ عرش سے نازک تر دربار ہے اور وہاں پر تو لوگ اپنی سانس پر بھی پابندی لگاتے ہیں کہ کہیں سانس بھی بلند طریقے سے نہ چلنے پائے۔

یہ قرآن مجید کی اس آیت کی دعوت ہے کہ: ”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول“
اس سلسلے میں ہوش کے چند ضابطے ہیں۔

[۱] ہر حال میں بڑائی کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو:

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا: اَذْنْتَ أَكْبَرُ أَوْ النَّبِيُّ ﷺ

اے حضرت عباس! مجھے بتاؤ آپ بڑے ہیں یا رسول اکرم ﷺ؟

بڑے ہیں پوچھنے والے کا مطلب تھا کہ: عمر کے لحاظ سے کون بڑا ہے؟ عموماً یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ کوئی بندہ اپنے والد کے دوست سے پوچھ لیتا ہے کہ آپ بڑے ہیں یا میرے ابا جی بڑے ہیں؟ اور اپنے چچا کے ہم عصر سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ آپ بڑے ہیں یا میرے چچا بڑے ہیں۔ تو اس انداز سے کسی نے رسول اکرم ﷺ کے چچا جان حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھ لیا: اَذْنْتَ أَكْبَرُ أَوْ النَّبِيُّ ﷺ آپ بڑے ہیں یا نبی علیہ السلام بڑے ہیں؟

اب غور کرنا! حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جواب کیا دیا، فرمانے لگے: حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہوا اکبر وانا ولدت قبلہ۔

(مختصر تاریخ دمشق، ۱۱/۳۳۶)، (سیر اعلام النبلاء، ۳/۴۰۰)

بڑے تو سرکار علیہ السلام ہی ہیں، لیکن ولادت میری پہلے ہوئی ہے۔ یعنی وہ لفظ جو عمومی طور پر بولا جاتا ہے اور یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں آپ سے دو سال بڑا ہوں۔ یا میں اتنے سال بڑا ہوں، یہ لفظ بولا جاسکتا تھا، مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے وہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ کہنے لگے کہ:

بڑے تو رسول اکرم ﷺ ہیں، لیکن میں صرف پیدا پہلے ہو گیا تھا۔ میری ولادت پہلے ہوئی ہے، میری عمر سرکار سے زیادہ ہے۔ مگر اقویٰ کا لفظ جب بولنا ہے تو اس میں یا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے محبوب ہر حال میں اکبر ہیں، وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ یہ صحابہ کرام کا انداز ہے۔ یہ سوچنا پڑے گا۔ آج تھڑے پہ بیٹھے ہوئے مسلمان کو تو دیکھنا پڑے گا، جو مسلمان اور امتی ہونے کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور ساتھ آپ کے منصب کے لحاظ سے یوں باتیں کرتا ہے کہ جیسے ”بڑے بھائی“ اور ”عام انسان“ کے بارے میں بول رہا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات وہ ذات کہ جن سے رسول اکرم ﷺ فرمانے لگے کہ یہ تو میرے باپ کی مثل ہیں۔

عَمَّ الرَّجُلِ صَبَوُ أَبِيهِ۔ (مسلم شریف، باب فی تقدیم الزکاۃ، حدیث نمبر ۱۶۴۳)

بندے کا چچا اُس کا باپ ہی ہوتا ہے۔

وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جن کو رسول اکرم ﷺ بولیں تو باپ کہہ کے بولیں۔

رُدُّوْا اِلَیَّ اَبِیْ عَبَّاسٍ۔ تم میرے ابا جی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بلا کے لے آؤ۔

سرکار ﷺ کہتے وقت اُن کو باپ کہہ کے بلائیں مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ قیامت تک کے مسلمانوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہیں جنہیں سرکار اپنا باپ کہیں۔ اس کے باوجود کہ مجھے سرکار باپ کہہ رہے ہیں۔

مگر میں منصب نبوت کا ادب تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جب عمر میں میں بڑا بھی ہوں لیکن میں اپنے آپ کو بڑا نہیں کہوں گا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اَنَا وَلِدْتُ قَبْلَهُ

میں پیدا سرکار سے پہلے ہو گیا ہوں..... لیکن هُوَ اكْبَرُ مِنِّي

جہاں تک ”بڑے“ ہونے کا معاملہ ہے تو وہ میرے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جنہوں نے سرکار ﷺ سے براہ راست دین حاصل کیا، قرآن مجید کے مخاطب ہیں اور جنہوں نے رسول اکرم ﷺ سے فیض پایا اور اُن کی اتنی عظیم شان ہے۔

ایک اونچے قد والے عظیم المرتبت انسان اور دوسری طرف ہماری طرح کے بالکل عام قسم کے لوگ ان کی گفتگو میں یہ فرق کیوں آ گیا ہے۔ اُدھر وہ اتنی عظمت سے بات کرتے ہیں۔ ادھر یہ لوگ بالکل سطحی سا انسان بنا کے پیش کرتے ہیں۔

یہ درمیان میں فرق عقیدے کی عظمت کا فرق پڑ گیا ہے، اور صحابہ کرام کے اذہان میں جو شان رسالت کا تقدس تھا اُس سے ان لوگوں کی سوچ کا مقام بالکل دور ہو گیا ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج بھی ہم اہل سنت و جماعت کو مقام نبوت کے متعلق بولنے میں وہی صحابہ والا ”ادب“ عطا فرمایا ہے۔

[۲] مثال میں بھی ادب:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: کہ کن جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ تو انہوں نے وہ جانور بتانے کے لیے اپنی چار انگلیوں سے اشارہ کیا؛ کہ سرکار علیہ السلام نے اس طرح چار انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا کہ ان چار جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔

صحابہ کرام کا یہ انداز تھا کہ بیان کرتے وقت حدیث کو مسلسل بنانے کے لیے جیسے سرکار

نے اشارہ فرمایا ہوتا ویسے ہی اشارہ کرتے تھے۔

جیسے رسول اکرم ﷺ مسکراتے ہوتے، ویسے ہی مسکراتے کہ ہم نے تو سرکار کا چہرہ دیکھا ہے لیکن بعد والے ہم سے لفظ بھی پڑھتے رہیں اور سرکار کی کیفیت کو معلوم بھی کرتے رہیں۔ کہ ہمارے محبوب علیہ السلام کا اُس وقت کیا انداز تھا جب آپ یہ گفتگو فرما رہے تھے۔ جس وقت رسول اکرم ﷺ نے ان جانوروں کو بیان کیا تھا جن کی قربانی جائز نہیں ہے، تو آپ نے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا تھا کہ چار جانور ایسے ہیں جن کی قربانی جائز نہیں ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے جب اُن جانوروں کے بارے میں پوچھا جن کی قربانی جائز نہیں ہے، تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ مجمع عام میں کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے: فَقَالَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

ایک دن سرکار ہمارے درمیان کھڑے تھے، رسول اکرم ﷺ نے اپنی چار انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ: ان چار جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کی چار انگلیوں سے اشارہ کیا۔ جب آپ یوں کر چکے تو دل میں خیال آیا کہ میں نے نبی علیہ السلام کی طرح اپنا ہاتھ قرار دے دیا؛ کہ محبوب علیہ السلام نے یوں فرمایا تھا اور میں بھی یوں ہی کر رہا ہوں۔ سرکار نے یوں ہاتھ کیا تھا، لیکن کہاں میرے آقا کا ہاتھ اور کہاں میرا ہاتھ۔ آج چھوٹے چھوٹے لوگ کہتے ہیں کہ: اُن کے بھی دو ہاتھ ہیں اور ہمارے بھی دو ہاتھ ہیں۔ ہاتھوں کی مشابہت خود زبان سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ یہ ہاتھ نبی علیہ السلام کے ہاتھ کی طرح ہے۔ بات کرتے وقت جب ہاتھ بلند کیا اور انگلیاں یوں کھولیں جیسے محبوب علیہ السلام نے چار کو بیان کرنے کے لیے کھولیں تھیں۔ لیکن فوراً اپنی گفتگو کو بدل دیا، وضاحت کی ہے۔ کیا عشق ہے صحابہ کرام کا اور کیا منصب نبوت کی پہچان ہے۔ یوں ہاتھ کر کے ارشاد فرمانے لگے:

أَصَابِعِي أَقْصَرُ مِنْ أَصَابِعِهِ۔ اے دیکھنے والو! ان انگلیوں کو دیکھ کے یہ نہ سمجھنا کہ سرکار کی انگلیاں ایسی ہیں، نہیں میری انگلیاں سرکار کی انگلیوں سے چھوٹی ہیں۔

أَصَابِعِي أَقْصَرُ مِنْ أَصَابِعِهِ۔
میری انگلیاں سرکار کی انگلیوں سے چھوٹی ہیں اور ساتھ ہی یہ فرمایا:

أَنَا مِلْحِي أَقْصَرُ مِنْ أَكَامِلِهِ۔

(ابوداؤد شریف باب ما یکرہ من الضحایا حدیث نمبر ۴۶۶، عون المعبود، ۷/ ۲۵۳)

میری انگلیوں کے پورے رسول ﷺ کی انگلیوں کے پوروں سے چھوٹے ہیں۔ یہ کہنا کیوں ضروری سمجھا کہ میں سمجھانے کے لیے مثال دے رہا ہوں، حدیث کو مسلسل بیان کرنے کے لیے اپنا ہاتھ دکھا کر ان کو سرکار کے ہاتھ کا تصور دینا چاہتا ہوں، کہیں کوئی یہ نہ سوچ بیٹھے کہ میرا ہاتھ رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ کی طرح ہے یا میں آپ کی طرح بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا نہیں نہیں۔ کہاں میری مجال اور کہاں میرے ہاتھ کی مجال۔ میں نے صرف تمہارے سامنے یوں کر دیا ہے کہ سرکار نے اپنا ہاتھ یوں کیا تھا۔

جہاں ہاتھوں کا تقابل ہے تو نہ میرے پورے اُن کے پوروں جیسے ہیں اور نہ میری انگلیاں سرکار کی انگلیوں جیسی ہیں اور نہ میرے پورے اُن کے پوروں جیسے ہیں:

”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

آج لوگ اپنی ضد سے یہ کہتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ ہمارے ہاتھ اور ہمارے ہاتھ اُن کے ہاتھ میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ لیکن حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ فرق ان میں بہت زیادہ ہے کہ: میرے ہاتھوں کو رسول اکرم ﷺ کے ہاتھوں سے تشبیہ نہ دینا اور اُن جیسا نہ سمجھنا۔

عون المعبود شرح سنن ابی داؤد میں ہے کہ یہ سب کچھ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے ادب کے پیش نظر کیا اور فوراً بولتے وقت آپ نے ہاتھ سے جب اشارہ کیا تو وضاحت ضروری سمجھی کہ یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں نبی علیہ السلام کے ہاتھ اپنے ہاتھ کو تشبیہ دے رہا ہوں، نہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بہت بڑا مظہر ہے۔ اُس ہاتھ کے ساتھ کسی کی کوئی برابری نہیں ہے۔

اس مقام سے صحابہ کرام کا منصب نبوت کے لحاظ سے جو عقیدہ ہے اور جوشان رسالت کے بارے میں گفتگو کا انداز ہے اُس کو سمجھنا بڑا آسان ہو گیا۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے پتا چلے گا کہ اب ادب کا درجہ (Grade) کتنا نیچے چلا گیا ہے۔ صحابہ کرام کا جو انداز تھا اُس انداز کو آج اُمت اپنائے گی تو پھر غیروں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اگر اُمت کے اندر سے ہی یہ دُھواں اُٹھتا رہے جس طرح کا دُھواں ”حفظ الایمان“ کتاب میں ہے یا ”تحدیر الناس“ میں ہے اور جس طرح گستاخیوں کا

دُھواں ”تقویۃ الایمان“ میں ہے۔ ایسی کتابوں میں جو گستاخانہ لہجے استعمال کیے گئے ہیں انہوں نے لوگوں کو جری بنادیا ہے کہ وہ بولتے وقت سوچتے ہی نہیں کہ ہم کس کے بارے میں بول رہے ہیں۔ لوگ تو اپنے اساتذہ کے بارے میں بولتے وقت پہلے محتاط ہو جاتے ہیں۔ جب کہ کچھ لوگ شانِ رسالت ﷺ کے بارے میں بول رہے ہیں۔

اس موضوع پر صحابہ کرام کی گواہیاں اور قرآن مجید کی آیت بیان کر کے ہم اس ماحول کے گستاخانہ دُھوئیں پر ابر کرم کا فیضان عام کرنا چاہتے ہیں تاکہ گستاخیوں کا دُھواں ختم ہو جائے اور پھر اُمتِ مسلمہ کو برکاتِ میسر آجائیں۔

[۳] جواب میں ادب:

رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے ایک سوال کیا، وہ سوال ایسا تھا کہ صحابہ کرام کو اس کا جواب آتا تھا۔

آج کے لوگوں کا انداز کیا ہے، وہ برابری تو کیا آگے بھی بڑھنا چاہتے ہیں کہ ان باتوں کا انہیں علم نہیں تھا، ہمیں ان باتوں کا علم آگیا ہے، لیکن وہاں صورتِ حال یہ ہے کہ سرکارِ ﷺ نے صحابہ کرام سے ایک سوال کیا۔ اُس سوال کا جواب سب کو آتا ہے مگر اُن میں سے نہ کوئی یہ بولتا ہے اور نہ ہی یہ سوچتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کو اتنا بھی پتا نہیں (معاذ اللہ) یا کوئی یہ کہتا کہ اس کا یہ جواب ہے۔

صحابہ کرام کا ادب اتنا ہے کہ جب سرکارِ ﷺ نے سوال کیا تو صحابہ کرام کی طرف سے جواب یہ تھا: اللہ ورسولہ اَعْلَمُ۔ اللہ زیادہ جانتا ہے اور اللہ کے نبی علیہ السلام زیادہ جانتے ہیں۔ یہاں تو ایک فتور پیدا ہو گیا کہ ایک اُمتی اُٹھ کے نبی علیہ السلام کے ہم پلہ ہونا چاہتا ہے۔ کوئی موقع ایسا آئے تو سہی کہتے ہیں کہ: دیکھو انہوں نے بھی ایسا کیا، ہم بھی ایسا کر رہے ہیں، بات برابر کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام کا انداز اس بارے میں کتنا عجیب اور نرالا ہے۔

[۴] سوال کا جواب دینے میں نہایت احتیاط:

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ اس کو روایت کرتے ہیں:

قال خطبنا رسول الله ﷺ يوم النحر۔

رسول اکرم ﷺ نے ۱۰ ذی الحج کے دن ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا، آپ نے سب سے یہ سوال کیا: اتدرون ای یوم هذا؟ تمہیں اے میرے صحابہ پتا ہے کہ آج کون سا دن ہے؟

آج کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سوال کرنے والا سوال تب کرتا ہے کہ جب اُسے کچھ پتا نہ ہو، تو معاذ اللہ آپ بھول گئے تھے کہ آج کا دن کون سا ہے۔ یہ بھی کسی کی سوچ ہو سکتی ہے۔

لیکن وہاں پر کیا ہے؟ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نے کہا:

اللہ ورسولہ اَعْلَمُ۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔

یعنی اس صورتِ حال میں بھی بڑی کشش ہے کہ جس بندے کو کچھ بھی جواب آتا ہو وہ اپنا علم ظاہر کرنے کے لیے بولتا ہے کہ اللہ کے نبی سوال کر رہے ہیں اور میں جواب دے رہا ہوں۔

صحابہ کرام یہاں پر یہ لذتِ محسوس کر رہے ہیں کہ اگرچہ ہمیں جواب آتا ہے، مگر ہمارے علم کی کیا حیثیت ہے، اللہ اور اُس کے نبی علیہ السلام کے علم کے مقابلے میں۔ ہر ایک کو اس کا جواب آتا ہے کہ یہ یومِ النحر ہے، قربانی کا دن ہے۔ لیکن اس انداز میں بولتا کوئی نہیں کہ وہ کہیں یا رسول اللہ ﷺ یہ تو یومِ النحر ہے۔ لیکن سارے یہی کہتے ہیں کہ: اللہ ورسولہ اَعْلَمُ۔

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا:

اتدرون ای شہر هذا؟ یہ مہینہ کون سا ہے؟

اب سب کو پتا ہے کہ حج ہمیشہ ذی الحج میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی بے صبرا اُمتی ہوتا تو پتا نہیں وہ کیا کہہ جاتا، لیکن یہ وہ ہیں جن میں ادب کوٹ کوٹ کے بھرا گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرکارِ ﷺ کے پوچھنے میں حکمت کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ جب سرکار نے دوسرا سوال کیا تو ہم نے کہا:

اللہ ورسولہ اَعْلَمُ۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔

پھر رسول اکرم ﷺ نے تیسرا سوال کیا:

اتدرون ای بلد هذا؟ تم جانتے ہو کہ یہ شہر کون سا ہے؟

اب سب کو پتا ہے کہ یہ مکہ شریف ہے۔ اگر اُن میں ہم سری کرنے کا جذبہ ہوتا تو وہ بولتے کہ یہ فلاں شہر ہے اور اگر (معاذ اللہ) سوچ کچی ہوتی تو یہ بھی خیال آ جاتا کہ شاید مجمعِ زیادہ دیکھ کر بھول گئے ہیں کہ شہر کون سا ہے!

اب تو اس طرح کے کلمے اُمتی بھی آگئے ہیں جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ وہاں

صحابہ کرام کا انداز ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ یہ شہر کون سا ہے؟ تو صحابہ کرام نے کہا: اللہ ورسولہ اَعْلَمُ۔ (بخاری شریف: باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من سامع، ۲۳۴)

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔

تو یہ صحابہ کرام کا انداز ہے کہ جس مقام پر انہیں پتا بھی ہے، جانتے بھی ہیں مگر پھر بھی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے جواب ایسا دیتے ہیں جس سے شان نکھر کے سامنے آ جاتی ہے۔

اب یہاں دو پہلو ہیں کہ اگر صحابہ سرکار کے ساتھ برابری کرتے تو یوں کہتے کہ: اے محبوب تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں۔ اس سے سرکار کے مقام کو نیچے لانے کی کوشش کرتے کہ اس کا ہمیں پتا ہے تو آپ کو بھی اس کا پتا ہوگا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم بھی جانتے ہیں اور آپ بھی جانتے ہیں مگر صحابہ کرام کہتے ہیں کہ اللہ بھی جانتا ہے اور آپ بھی جانتے ہیں۔ یعنی وہ شان رسالت کو کھینچ کے نیچے نہیں کرنا چاہتے؛ بلکہ وہ شان رسالت کا مقام بلند بیان کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہو سکتا تھا کہ جب جواب آتا ہے تو وہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں بھی اس کا پتا ہے، آپ کو بھی پتا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ: اے محبوب اللہ کو بھی پتا ہے اور آپ کو بھی پتا ہے، اللہ بھی زیادہ جانتا ہے آپ بھی زیادہ جانتے ہیں، لیکن یہ انداز صحابہ کرام کی گفتگو کا ہے کہ وہ منصب نبوت کو بولتے وقت یوں بیان کرتے ہیں کہ: ”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

اس کو بیان کرتے وقت اپنے ساتھ نہ ملاؤ۔ رب ذوالجلال نے اُن کا نام اپنے نام کے ساتھ ملایا ہے۔ اس کے بعد اس طرح کی صورت حال بھی پیش ہوتی رہی کہ رسول اکرم ﷺ سے کوئی سوال کیا گیا تو آپ خاموش ہو گئے۔

آج کا ایک انداز جو معاذ اللہ کچھ لوگوں نے پیدا کر دیا ہے۔ باقاعدہ وہ تقریروں میں بیان کرتے ہیں کہ تم جس پیغمبر کے علم کے ترانے پڑھتے ہو اُن سے جب پوچھا گیا تھا تو وہ چپ ہو گئے تھے، یہ سوچ؛ کبھی سوچ ہے، اور یہ سوچ منصب نبوت کے بارے میں بے ادبی والی سوچ ہے۔ اور ادھر صحابہ کرام کا انداز کیا ہے، وہاں جو انداز ہے اللہ تعالیٰ نے وہی انداز آج بھی اہل حق کو عطا فرمایا ہے۔

[۵] کیفیات رسول اللہ ﷺ کی عملی تعبیر:

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انما اخاف علیکم من بعدی ما یفتح علیکم من زهرة الدنيا

وزینتها۔ (بخاری شریف: باب الصدقة علی الیتامی، حدیث نمبر ۱۳۷۲)

مجھے اپنی اُمت پر جن باتوں کا خطرہ ہے وہ دُنیا اور اُس کی زینت ہے۔

دُنیا کی محبت کے دروازے کھل جائیں گے، مجھے اُمت پر اس کا خطرہ ہے، شرک کا کوئی

خطرہ نہیں: ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی۔

(بخاری شریف: باب الصلوة علی الشہید، حدیث نمبر ۱۲۵۸)

مجھے تم پر شرک کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مجھے دُنیا کے دروازوں کے کھل جانے کا خطرہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب دُنیا آ جائے گی تو کہیں اُس کی چمک میں اُمت ڈوب نہ جائے تو ایک آدمی نے عرض کیا:

یا رسول اللہ ﷺ اویاتی الخیر بالشر۔

کیا خیر سے بھی شر برآمد ہو سکتا ہے؟ دُنیا میں رزقِ حلال اگر زیادہ آ جائے گا تو اس کا خطرہ پھر کیا، چوں کہ حرام کی تو بات ہی نہیں کی جا رہی، چوری اور ڈاکے سے آنے والے مال کی بات نہیں کی جا رہی۔ کسبِ حلال سے رزق میں فراوانی ہو جائے گی۔

آج صفہ پہ جن کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا کل ان ہی لوگوں کے پاس لاکھوں ہزاروں دینار آ جائیں گے اور پھر آگے اُمت میں جو مال آنے والا تھا اُس کا بیان کیا۔

صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مال تو خیر ہے۔ کیا خیر سے بھی شر برآمد ہو سکتا ہے؟ صحابی نے یہ سوال کیا تو فسکت النبی ﷺ۔ رسول اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔

خاموش ہونے پر ایک ہے آج کے کند ذہن اُمتی کا تبصرہ؛ اور ایک ہے صحابہ کرام کا تبصرہ۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسے رسالت کے جو مقامات ہیں اس بارے میں یہ کہتا ہوں کہ:

”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

یہاں بولتے وقت اپنے تبصرے مت جھاڑو، جو سامنے بیٹھے تھے اُن سے پوچھو۔

جنہوں نے نبوت کا چمکتا چاند اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؛ اور جن کے ذہن کے آنگن میں اُس چاند کی چاندنی براہِ راست اُترتی رہی ہے، اُن صحابہ کرام سے پوچھو کہ وہ ایسے موقع کو سمجھتے تھے تو کیا سمجھتے تھے۔ جس وقت رسول اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔

آج جس وقت ایسی باتیں سنتے ہیں تو دانت کھٹے ہوتے جاتے ہیں اور باتیں آتی جاتی ہیں کہ تم یہ کہتے ہو کہ اُن کا اتنا علم ہے۔ لیکن جب اُن سے سوال ہوا تھا تو وہ چپ ہو گئے تھے۔ آج اُن لوگوں کو بولتے وقت شرم نہیں آتی۔

اب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا انداز دیکھو کہ جس وقت رسول اکرم ﷺ خاموش ہوئے تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ: ہمارے نبی علیہ السلام کا علم ہی تھوڑا سا ہے۔ صحابی نے سوال

کیا اور نبی علیہ السلام چپ کر گئے ہیں، صحابی کو خیال تک نہیں آیا۔
جس وقت بولے ہیں تو عظمتِ نبی کو ظاہر کر کے بولے ہیں، چپ ہونے کو انہوں نے یہ
نہیں سمجھا کہ آپ کو جواب دینے میں کوئی مشکل واقع ہو رہی ہے۔

جب رسول اکرم ﷺ خاموش ہوئے تو صحابہ کرام نے اُس سائل کو جھاڑا:

قِيلَ لَهُ مَا شَأْنُكَ تَكَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ وَلَا يَكَلُمُكَ.

صحابہ نے اس آدمی سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ تم کیسے ہو، تم سے تو نبی علیہ السلام بولنا پسند ہی
نہیں کر رہے، لہذا تمہارے سوال میں کوئی کمی ہے، تمہارے انداز میں کوئی کمی ہے۔ تم بولتے ہو
لیکن سرکارِ تم سے بولنا پسند نہیں کر رہے۔ اب اس میں صحابہ نے عظمتِ سرکارِ علیہ السلام کی ظاہر کی؛
اور یقیناً وہ عظمتِ سرکارِ ہی کی تھی اور ہے۔ صحابہ کرام انداز بتا رہے تھے کہ اُمّی کا حق نہیں ہے کہ
ایسے موقع پر اپنی زبان کھولے اور منصبِ نبوت پر تنقید کرنا شروع کر دے۔

صحابہ کرام کہتے ہیں کہ محبوبِ خاموش ہو گئے ہیں۔ تو اے سائل! تیرا انداز ٹھیک نہیں ہے،
تیرا سوال درست نہیں ہے، تجھ میں کوئی کمی ہے۔ تم سرکار سے بولتے ہو لیکن سرکار تجھ سے بولنا پسند
نہیں کر رہے اور سرکار تیرے سوال کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کا جواب دیا جائے۔

یہ صحابہ کرام کا انداز اور اپنے طور پر یہ تبصرہ واضح کر رہا ہے کہ:

”یہ نشانِ رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

رسول اکرم ﷺ کے چپ ہو جانے پر صحابہ کرام نے سائل کو جھڑکا کہ تمہارا سوال ٹھیک
نہیں تھا۔ رسول اکرم ﷺ تو سائل کے دل سے واقف ہوتے ہیں اور سائل کی کیفیت سے
واقف ہوتے ہیں، سائل کے پس منظر سے واقف ہوتے ہیں اور ہر چیز کو سامنے رکھ کے پھر جواب
دیتے ہیں اور کبھی چپ کر جاتے ہیں تو اس میں بھلا سائل کا ہی ہوتا ہے۔ اگر بولا تو سب کچھ اس کا
ظاہر ہو جائے گا۔ کبھی چپ کر جاتے ہیں تو قرآن کہتا ہے:

يَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ۔ (سورة المائدة، آیت ۱۵)

جب سرکار نہ بولیں تو معاف کر دیتے ہیں، یہ نہیں کہ جواب نہیں آتا معاف کر دیتے ہیں،
یہاں پر صحابہ کرام نے نشانِ نبوت کو بالکل بے غبار سمجھا ہے اور عظمتِ بیان کر رہے ہیں۔ صحابہ سمجھ
رہے تھے کہ سائل کا سوال اچھا نہیں ہے۔

لیکن رسول اکرم ﷺ نے تھوڑی دیر کے بعد جب سر اٹھایا تو آپ نے پوچھا:
أَيُّنَ السَّائِلُ۔ وہ سائل کہاں ہے؟

صحابہ کہنے لگے: اس سے ہمیں پتا چلا کہ آپ نے سائل کے سوال کو پسند فرمایا ہے۔ چوں کہ
آپ نے سائل کو پیار سے آواز دی ہے۔ جو سر جھکا یا تھا وہ اس لیے جھکا یا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی
طرف سے وحی کا پیغام نازل فرما دیا تھا۔ تو صحابہ کرام کا یہ عشق ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ: سائل کے
سوال میں کوئی کمی باقی رہ گئی ہے، آپ اس کا جواب دینا پسند نہیں کر رہے۔ تو یہ ایک اُمّی پر لازم
ہے کہ ایسے مقامات جس وقت آئیں تو یقیناً اُن میں کوئی عظمت موجود ہوتی ہے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ عرش سے اتنا ڈائریکٹ (Direct) رابطہ ہو، ادھر سائل سوال کر
رہا ہو ادھر جبریل سدرہ سے نیچے آرہے ہوں یہ تو محبوبِ علیہ السلام کا کمال ہے اور آپ کی شان
ہے۔ لہذا صحابہ کرام یہ طریقہ سکھا رہے ہیں کہ: سیرتِ نبی علیہ السلام کو پڑھتے وقت اور آپ کے
بارے میں بولتے وقت انداز وہ ہونا چاہیے جو انداز اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو عطا فرمایا ہے۔

[۶] [بظاہر تھوڑے کوز یا دہ مانسنا:]

اسی طرح صحابہ کرام نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن سے نبی علیہ السلام کی عبادت
کے بارے میں پوچھا کہ: محبوبِ رات کو کتنی عبادت کرتے ہیں یعنی یہ اُن کو شوق ہے کہ نبی علیہ السلام
کی گھر کی عبادت کیا ہے اُس کا بھی ہمیں پتا ہو، تاکہ ہم مزید عبادت کریں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

فَلَمَّا أَخْبَرُوا كَاتِمَهُمْ تَقَالَوْهَا فَقَالُوا أَيْنَ مُحَمَّدٌ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ

(بخاری باب التروغيب في النكاح ۲/ ۷۵۷)

جب انہیں خبر دی گئی تو ایسے لگا جیسے انہوں نے اس عبادت کو کچھ کم خیال کیا ہو پس کہنے
لگے: کہاں رسول اللہ ﷺ اور کہاں ہم۔ اس کے بعد امتحان شروع ہو گیا۔ اگر آج کا خشک اُمّی
ہوتا تو جس وقت وہ بولتا وہ تنقید کرتا کہ یہ کیسے نبی ہیں رات کو اتنی عبادت ہی نہیں کرتے۔ یہ کیسے
ہیں، ہم سمجھتے تھے کہ رات کو بڑی عبادت کرتے ہوں گے اور یہ تو کوئی زیادہ عبادت نہیں کرتے۔

ایسا لفظ انہوں نے نہیں بولا جس وقت انہیں عبادت کا پتا چلا۔ اور وہ عبادت ہے بہت بڑی عبادت
چوں کہ پاؤں پہ درم آ جاتے ہیں، پاؤں سوج جاتے ہیں، مگر صحابہ کرام کے ذہنوں پر نبی علیہ السلام
کے تقوے کا جتنا اثر ہے صحابہ اپنے طور پر اور بھی سوچے ہوئے تھے لیکن جب اپنی سوچ کے مکمل

مطابق انہیں جواب نہیں ملا تو اُن کے ذہنوں نے اس کا کیا نتیجہ نکالا وہ آپس میں بیٹھ کر کہنے لگے: بھائیو! وہ تو اللہ کے محبوب ہیں۔ آپ کی اتنی عبادت بھی بہت زیادہ ہے، ہمیں کچھ اپنے بارے سوچنا چاہیے، یہ اُن کا انداز ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں، اُن کا مقام رب کے دربار میں بہت بڑا ہے۔

ایک آدمی بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ وہ کسی کانوکر ہے اور دوسرا آدمی وزیر ہے۔ اُس کے ساتھ کرسی پہ بیٹھتا ہے، گھنٹہ یادو گھنٹے بادشاہ کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اُس وزیر کا گھنٹہ یادو گھنٹے بادشاہ کے ساتھ بیٹھ جانا اُس نوکر کے بارہ گھنٹوں سے زیادہ مقام رکھتا ہے۔

اللہ کے جو وزیر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اُن کے عمل کی قدر (Value) اور ہے اور عام بندے کے عمل کی قدر اور ہے۔ اس کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جب صحابہ کرام کے سامنے مشکل مقام آیا تو رسول اکرم ﷺ کی ذات کے بارے میں فوراً یہ تبصرہ کیا کہ یہ نبی علیہ السلام کی عبادت ہے اتنی بھی بہت زیادہ ہے۔ اور ہمیں مزید بندگی کرنی چاہیے، کیوں کہ ہمارا درجہ اللہ کے دربار میں وہ نہیں ہے جو رب نے اپنے محبوب کی اداؤں کو عطا فرمایا ہے۔

یہاں میں وضاحت کر دوں۔ حقیقت میں وہاں قلت نہیں تھی کیوں کہ رسول اللہ ﷺ جو عمل فرماتے تھے اس میں دوام ہوتا تھا۔ صحابہ کے الفاظ ان معمولات کے لحاظ سے دوام کا تصور کیے بغیر تھے، ورنہ دوسری جگہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف رسول اللہ ﷺ کی گھر کی بندگی ایسی بیان کی گئی جس میں عقلیں حیران ہیں اور انہوں نے فرمایا:

أَيْكُمْ يُطِيعُ مَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُطِيعُ - (بخاری شریف ۱/ ۲۶۷)

تم میں سے کسی کی طاعت رسول اکرم ﷺ جتنی ہے یعنی کسی کی نہیں۔

”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے سوچ کے بول۔“

آپ ﷺ کے خطبہ میں اتنی مٹھاس تھی کہ کسی کی تقریر پر اتنے لوگوں نے کلمہ پڑھا ہے جو توحید کا نور پھیلا اور قیامت تک پھیل رہا ہے۔ یہ رسول اکرم ﷺ کے اُس انداز کی وجہ سے ہے۔ یہ سرکار کی شان ہے کہ آپ بتوں کی مذمت کرنے والے ہیں اور یہ آپ کا کمال ہے کہ اُس بت پرستی کے ماحول میں آپ نے تقریریں کیں، اور وہاں پر اللہ تعالیٰ کی توحید کے جھبٹے لہرائے ہیں۔ بات سچی ہے مگر یہی بات کفار نے کہی۔

قرآن مجید میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ بتوں کے خلاف تقریریں کرتے ہیں، بتوں کی مذمت کرتے ہیں، یہ بات کفار نے اپنے لہجے میں کی، لہجہ کیا تھا؟ اُن کا لہجہ استفہامیہ انداز کا تھا۔

یوں سمجھو کہ رسول اکرم ﷺ کسی گلی سے گزر رہے تھے اور قریش کہیں اپنے ڈیرے پر بیٹھے تھے۔ جب سرکار گزرے دور دور تک یہ شہرہ ہو چکا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ بتوں کے زبردست خلاف ہیں، کچھ لوگوں کو قریش میں سے پتا تھا اور کچھ لوگوں کو ابھی تک پتا نہیں تھا۔

جب محبوب علیہ السلام گزرے تو ایک اُن میں سے بولا:

أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ إِلَهَتَكُمْ؟ یہ ہے وہ جو بتوں کو گالیاں دیتا ہے۔

یہ ہے وہ جو تمہارے خداؤں کے خلاف بولتا ہے۔

یہ ہے وہ جو ہمارے خداؤں کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔

اب یہ بات تو سچی ہے کہ نبی علیہ السلام بتوں کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور بتوں کی مذمت کرتے ہیں، مگر اُن کا انداز تو بین والا ہے کہ:

أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ إِلَهَتَكُمْ؟ - (سورۃ الانبیاء، آیت ۳۶)

کیا یہ ہیں وہ جو ہمارے بتوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ کہاں ہمارے بتوں کی شانیں اور کہاں یہ خلاف ورزی کرنے والا، کہاں ہمارے بتوں کا مقام اور کہاں یہ انسان جو ہمارے اُن بتوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ یہ کب اُن بتوں کا رستہ روک سکے گا۔ یہ انداز اُن کا تو بین والا تھا۔

ہمزہ استفہام کے بعد والا کلام اَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ إِلَهَتَكُمْ سو فی صد سچا ہے، مگر جب انداز ایسا تھا تو اللہ نے اُن کی بات کو کیا کہا کہ قریش کیا کر رہے ہیں، مشرک کیا بولتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا -

میرے محبوب جب کافر تجھے دیکھتے ہیں تو یہ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں، جب دیکھا تجھے اے محبوب کافروں نے۔

إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا - (سورۃ الانبیاء، آیت نمبر ۳۶)

انہوں نے تمہارا مذاق اڑایا ہے، کس چیز کو مذاق کہا وہ سچی بات جو استفہامیہ انداز میں کی گئی تھی۔ وہ سچی بات جس کا انداز صحیح نہیں تھا، وہ سچی بات جو بیان کرنے والے نے غلط انداز میں بیان کی ہے، تو قرآن اس کو ثابت کر رہا ہے۔ اگر سچی بات کو گستاخانہ لہجے میں بیان کیا جائے تو اللہ کا قرآن کہہ

رہا ہے کہ اُس بندے نے شانِ رسالت کو بیان نہیں کیا۔ وہ سرکار کی ذات سے مذاق کر رہا ہے۔
کس چیز کو کھڑو؟ کہا گیا یہ اَھَذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اِلَہَکُمْ۔ کا بیان ہے۔ نبی علیہ السلام کو
دیکھ کر جس وقت کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ ہیں وہ جو بتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور انہوں نے
سرکار کو (معاذ اللہ) چھوٹا ثابت کرنا چاہا اور اپنے بتوں کو بڑا ثابت کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
کہ اے محبوب یہ تمہارا مذاق کر رہے ہیں۔

اِنَّا کَفَّیْنٰکَ الْمُسْتَهْزِئِیْنَ۔ (سورۃ الحجر، آیت نمبر ۹۴)

مگر میرے محبوب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں ان سے ایک ایک بات کا حساب لے لے
والا ہوں۔

پتا چلا کہ شانِ رسالت اتنا نرم مقام ہے اور اتنا ”نازک مسئلہ“ ہے کہ سچی بات کو بیان کرتے
ہوئے انداز گستاخانہ آجائے تو اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم اس کو خطبہ نہ کہو، اس کو تقریر نہ کہو، اس کو شریعت
کا بیان نہ کہو، یہ مذاق ہے جو میرے محبوب علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔
یہ تو پھر بھی انداز میں کچی ہے، لیکن اگر دل میں بُرا خیال آئے گا تو بندہ تباہ و برباد ہو جائے
گا۔ یعنی اُس کے ایمان کی حیثیت جاتی رہے گی۔ کوئی حیثیت اُس کی باقی نہ رہے گی۔
شانِ رسالت کے متعلق حوالہ جات پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس وقت ایک سوغات ثابت ہوگی،
دور دور تک اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔

[۷] رسول اللہ ﷺ کے بارے میں میلی سوچ بربادی ہے:

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ مسجد میں آئیں اور نبی علیہ السلام
مسجد میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ رات کا وقت تھا یعنی اندھیرا چھا چکا تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا
کھانا دینے یا کسی کام کے لیے آئیں۔ جس وقت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رخصت ہونے لگیں تو مسجد
کی حد کے اندر ہی اپنی اہلیہ محترمہ کو رخصت کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور مسجد کے صحن میں
حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس کھڑے ہو گئے: فَمَرَّ بِهِ رَجُلَانِ۔ دو انصاری صحابہ کا گزرا ہوا۔

جب وہ وہاں سے گزرے تو سرکار ﷺ نے انہیں دیکھ لیا کہ ان دونوں نے مجھے اس حال
میں دیکھا ہے کہ میں ایک عورت کے پاس کھڑا ہوں تو آپ نے فرمایا:

عَلٰی رَسْلِکُمْ۔ تم دونوں یہیں ٹھہر جاؤ: اِنَّمَا هِيَ صَفِیَّةٌ۔

(بخاری شریف، باب ہل یخرج المعتکف لحوالہ الی باب المسجد، حدیث نمبر ۱۸۹۴)

آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمہاری اُمّی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، خود اس کی وضاحت
کرنا چاہی کہ یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ تو اُن دو انصاری صحابہ نے کہا: سبحان اللہ۔

اے محبوب ہمارے لیے اس وضاحت کی ضرورت کیا تھی، ہم کیا آپ کی ذات کے بارے
میں کچھ سوچ سکتے تھے، کیسے ہمارا ضمیر گوارا کر سکتا تھا کہ آپ کا کلمہ بھی پڑھیں اور آپ کے بارے
میں نازیبا بھی سوچیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

یہ ہے شانِ رسالت کہ جہاں اُن کے سبحان اللہ کہا جاتا ہے: اِنَّمَا هِيَ صَفِیَّةٌ۔

یہ حضرت صفیہ ہیں، تو اُن دونوں نے تعجب سے کہا سبحان اللہ! حضور ہمارے لیے اس
وضاحت کی ضرورت نہ تھی، ہم تو آپ کو جاننے والے ہیں، ہم تو سوچ نہیں سکتے تھے کہ کوئی اور
عورت ہو، اور سرکار اُس کے پاس کھڑے ہوں، ہم یہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔

چوں کہ میرے محبوب علیہ السلام کی نگاہ دیکھنے والی تھی۔ میں تو کہتا ہوں۔

تیری نظر خازنِ رشب میں گلاب تحریر کر چسکی تھی

اُجاڑ نیندوں کے خواب میں انقلاب تحریر کر چسکی تھی

میرے ذہن کے فلک پر سوال چسکے تو میں نے دیکھا

تیرے زمانے کی خاک اُن کے جواب تحریر کر چسکی تھی

اس کا مطلب کیا تھا؟ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تم ٹھیک ہو مگر مجھے قیامت تک
منبروں پہ بیٹھے ہوئے کچھ ملاں نظر آرہے ہیں اور مجھے قیامت تک گلیوں کے تھڑوں پر بیٹھے ہوئے
کچھ مسنڈے نظر آرہے ہیں جن کو شانِ نبوت کے بارے میں بولتے وقت حیا نہیں آئے گی، میں
اس کی وضاحت اس لیے کر دینا چاہتا ہوں تاکہ اس سے وہ سبق سیکھیں۔

اس لیے میرے صحابہ مجھے تم سے خطرہ نہیں ہے، خطرہ اُن سے ہے جو مجھے نہیں دیکھ سکیں گے
اور پھر باتیں ایسی کریں گے۔ میرے آقا علیہ السلام فرمانے لگے:

اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنْ اَبْنِ اَدَمَ فَجَرِّی الدَّمِ۔

شیطان بڑا خبیث ہے۔ یہ وہاں جاتا ہے جہاں خون جاتا ہے۔ انسان کے اندر اتنا شیطان
سرائت کر جاتا ہے: فَجَرِّی الدَّمِ۔ خون کی وین (Vein) یعنی رگ میں اور پھر پورے بدن

میں چکر لگاتا ہے اور انسان کے اندر بڑی گندگی ڈال دیتا ہے۔ تم سچے ہو مگر قیامت تک کے خطرے بھی تو سامنے ہیں، وہاں جو بے حیا سوچ ہوگی، اُس کو بھی تو سمجھنا مقصود ہے۔

میرے صحابہ میں اس لیے بولا ہوں کہ شیطان انسان کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔

فَقِفْتُ أَنْ يَتَّقِيَنَّ فِي قُلُوبِكُمْ شَيْعَ فَتَهْلِكَا.

مجھے خطرہ ہے کہ یہ شیطان جو خون میں شامل ہو جاتا ہے کہیں تمہارے دل میں کوئی بات نہ ڈال دے، زبان پر نہیں: فِي قُلُوبِكُمْ۔ تمہارے دل میں کوئی بات نہ ڈال دے۔

اگر تم میرے بارے میں دل میں سوچو گے یا قیامت تک کوئی اُمتی میرے بارے میں نازیبا سوچے گا تو پھر کیا ہوگا۔

فَتَهْلِكَا۔ (کشف الغمہ: ۱/۳۵۵) پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

میں نے اس لیے وضاحت کی کہ یہ صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، کہ شیطان خون میں داخل ہو جاتا ہے اور بندے کے لیے کئی خیال لاسکتا ہے۔ اگر میرے بارے میں تمہیں کوئی نازیبا خیال آگیا تو تم دونوں ہلاک ہو جاؤ گے، تمہارا ایمان سلامت نہیں رہے گا اور قیامت تک کے لوگوں کو سمجھنا مقصود تھا۔ صحابہ کرام تو سہارا ہیں اور وہ پل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے شریعت ہماری طرف گزر کے آرہی ہے۔ اس واسطے خطاب اُن کو کیا۔ اُن کے دماغ بڑے پاک ہیں، اُن سے ہو کر بات ہم تک پہنچنے والی تھی؛ اس واسطے فرما دیا کہ اگر شیطان کی وجہ سے ایسا خیال آگیا تو پھر اس کا انتظار نہیں ہوگا کہ تم زبان سے بولتے ہو یا نہیں بولتے۔

جوں ہی دل میں خیال آتا جائے گا ہلاکت آتی جائے گی، ایمان لٹ جائے گا۔ عقیدہ مٹ جائے گا۔ عظمت ختم ہو جائے گی: ”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

اس سے آگے بھی شان رسالت یہ ہے کہ: ”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے سوچ۔“ یہاں تصور کرتے وقت بھی پہلے اپنے دماغ کو وضو کرنا پڑے گا، اپنے خیال کو اعتکاف کروانا پڑے گا، اپنے تصور کو احرام بندھوانا پڑے گا، اور اپنی سوچ کو تقدس کا غسل دے کر اُسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی طرف سے جانا پڑے گا، کیوں کہ یہاں پر اگر کچھ بھی نازیبا خیال آگیا تو اسی سے تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ یعنی ہلاکت ایمانی ہو جائے گی۔

اس سے پتا چلا کہ شان رسالت کا معاملہ بڑا ہی نرم ہے۔ بڑا ہی نازک ہے۔ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی سوچ پر بھی پابندی لگانے کے لیے صحابہ کے سامنے وضاحت فرمادی کہ یہ موقع ایسا بن گیا ہے کہ سوچ انسان کو آسکتی ہے۔ میں فوراً بولا ہوں کہ میں چپ رہوں ادھر سوچ آجائے اور پھر تمہارے ایمان کا خاتمہ ہو جائے اور بعد میں بولوں نہیں میں فوراً بولتا ہوں تاکہ ایسی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ میرے بارے میں اتنا نازیبا خیال کہیں آجائے گا تو پھر وہاں ایمان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ شان رسالت کا یہ بڑا اہم اور بڑا عظیم مسئلہ ہے اور یہ ایک سوغات ہے اور جس وقت آج ماحول میں بے ادبی کے دھوئیں اُٹھ رہے ہیں۔ اپنے ماحول کی صفائی ضروری ہے تاکہ غیروں کو پتا چلے کہ کتنا خوب صورت تصور ہوتا ہے جب یہ سرکارِ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کچھ الفاظ کو آڑ بنا لیا اور اُس آڑ میں گستاخیاں کرتے ہیں۔

[۸] لہو کا معنی کرنے میں ہوش:

مثال: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا توبہ واستغفار کرنا اس کو کچھ لوگوں نے آڑ بنا لیا کہ جس وقت سرکارِ صلی اللہ علیہ وسلم اُسْتَغْفِرُ اللہ کہتے ہیں کہ میں مغفرت چاہتا ہوں۔ تو پہلے (معاذ اللہ) کوئی گناہ کیا ہوگا پھر ہی مغفرت چاہ رہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہم صحابی نے نقش و نگار والی نئی چادر پیش کی تھی۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر اپنے اوپر اوڑھی اور نماز ادا کی جس وقت نماز سے فارغ ہوئے۔ تو ارشاد فرمایا:

اَذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذِهِ اِلَى اَبْنِي جَهْمٍ وَ اَتُونِي بِاَنْبِجَانِيَّةٍ.

یہ چادر ابو جہم کو واپس کر دو اور میری چادر جو انجانیہ ہے، یعنی سادہ چادر جس پر نقش و نگار بنے ہوئے نہیں ہیں، وہ لے آؤ۔

آپ نے ارشاد فرمایا: اِنَّهَا اَلْهَتْنِي اِنْفَاعَن صَلَاتِي.

(بخاری شریف باب اذا صلی فی ثوب لہ اعلام ونظر الی علیہا حدیث نمبر ۳۶۰، جلد نمبر ۱، ص ۵۴)

”اس نقش و نگار والی چادر نے ابھی میری توجہ نماز سے ہٹائی ہے۔“

اس واسطے میں یہ چادر نہیں اوڑھوں گا۔ یہ چادر ابو جہم کو واپس دے دو اور اُن سے مسیری سادہ چادر لے آؤ۔ یہ چادر انہیں کی تھی، تو آپ نے فرمایا کہ انہیں کوئی چادر واپس کر دو۔ یا اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ریشم کا جبہ دیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ریشم تو

پہننا حرام ہے آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں۔
یعنی اس سے یہ مقصد نہیں تھا کہ ابوجہم یہی چادر پہن کر نماز پڑھیں یا تو انہیں کی طرف سے تحفہ تھا انہیں واپس کر دیں، یا پھر ویسے دی ہے کہ وہ بیچ سکتے ہیں۔ بہر حال سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا میں تو اپنی سادہ چادر پہنوں گا، کیوں؟ اس لیے کہ اس نے نماز میں خلل پیدا کیا ہے۔ یہاں پر ایک عام سی سوچ کہ نماز پڑھتے پڑھتے چادر کے نقش و نگار پر درمیان میں رکاوٹ آگئی، ہم تو ایسی چادروں میں پڑھ لیتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہوتا، اب تو مسجد میں بھی نقش و نگار ہوتا ہے اور مصلے پر بھی نقش و نگار ہوتا ہے، ایک سوچ کا یہ انداز ہے۔

اس سے پتا چلا کہ معاذ اللہ! ہماری روحانیت تیز ہے۔ ہم تو نقش و نگار والی ایسی چیزوں میں پڑھ لیتے ہیں، ہمیں تو کچھ نہیں ہوتا اور نبی علیہ السلام نے نقش و نگار والی چادر اتار دی۔
اَلْهَثْبَنِي۔ اس چادر نے میری نماز میں خلل ڈالا ہے۔

ان الفاظ کو آڈ بنا کے پھر لوگ نیا بھڑاس نکالنا شروع کر دیتے ہیں کہ ”وہ ہم جیسے ہیں اور ہم اُن جیسے ہیں، وہ بھی بھول جاتے ہیں اور ہم بھی بھول جاتے ہیں، اُن کی توجہ بھی بٹ جاتی ہے ہماری توجہ بھی بٹ جاتی ہے۔ ہم میں اور اُن میں فرق کیا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اُن پر وحی اُترتی ہے ہم پر وحی نہیں اُترتی۔“

اب اَلْهَثْبَنِي والا انداز سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک ہے طے شدہ حقیقتیں اور ایک ہے درمیان میں وضاحت کی چیزیں۔ حضرت امام نورالحق دہلوی فرمانے لگے اس کی شرح کرتے ہوئے:
”وَاَنكَهَ حَالِ اَنَسْرِ وَرَصَلِي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَلٰہِ وَسَلَمَ عَالِي تَرَازِ اَنَسْتِ
کہ چیز ی اور احضوری کہ در نماز داشت باز داشتہ باشند“

ہمارے محبوب علیہ السلام کا مقام اس سے کروڑ درجہ اوپر ہے کہ کوئی چیز آپ کو اللہ کے دربار سے پیچھے ہٹا سکے۔ چادر تو کیا اگر ہزار بندے آکر درمیان میں حجاب بننا چاہیں اور سرکار کو جو اللہ کے دربار میں حضوری حاصل ہے؛ ہزار بندے خلل نہیں ڈال سکتے، چادر خلل کہاں ڈال سکتی ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مرتبہ ہے اُس کے لحاظ سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس حضوری میں خلل ڈال سکے۔ پھر کہنے لگے کہ اس حدیث کی شرح یوں کی جاسکتی ہے:

”کہ حضور حق را مراتب و درجات غیر متناہی است۔“

اللہ کے حضور میں حاضر ہونے کے درجات اور مراتب غیر متناہی ہیں۔

یہ نہیں کہ وہ ایک ہزار ہیں یا ایک لاکھ ہیں، ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔ حضوری کے درجات غیر متناہی ہیں۔ حضرت شیخ نورالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ: اللہ کے دربار کی حضوری کے درجات اربوں ہیں ع و آن مرتبہ کہ خاصہ آن حضرت بود

اور ہمارے محبوب علیہ السلام کی حضوری کا جو درجہ ہے ع اگر ازاں جاتنزل نماید
اگر سرکار اُس درجے سے نیچے بھی کچھ آجائیں یعنی حقیقی درجے سے سرکار کچھ نیچے آجائیں۔
”ہنوز درجائی خواهد بود کہ مقربان دیگر بصدد جہد و فناء عمر ہای و راز آنجا نرسیدہ باشند۔“

(تَیْسِيَةُ الْقَارِي ۱/۱۴۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے قرب میں درجات ہیں وہ غیر متناہی ہیں۔ اگر اُس چادر کی وجہ سے سرکار کا تنزل ہوا ہو تو پھر بھی اُس مقام پر اللہ کے قرب میں ہیں کہ بڑے بڑے صالحین ساری عمریں صرف کر کے حضوری کے اُس درجے تک نہیں پہنچ سکتے؛ جس درجے پر سرکار نقش و نگار والی چادر پہن کر موجود ہیں۔

عام لوگوں کی حیثیت عام جیسی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ارب درجے ہوں تو ہم جیسوں کو اُن میں سے ایک درجہ حاصل ہے اور ہمارے محبوب علیہ السلام کو حضوری کے اربوں درجے حاصل ہیں، اور سرکاریہ چاہتے ہیں کہ رب کے دربار میں اُن اربوں درجوں میں سے اگر کسی وجہ سے ایک درجہ بھی کم ہو تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اگرچہ کم ہو جانے کے بعد بھی حالت ایسی ہے کہ ساری دنیا کے درجات اکٹھے کر لیے جائیں پھر بھی سرکار کے حضوری والے درجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ اس حدیث شریف کی حقیقت ہے جس کو حضرت امام نورالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر صالحین نے بیان کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو سمجھنا ہے تو اس کی مثال یوں سمجھ لو: ایک ہے عینک کا شیشہ اور ایک ہے دروازے کا شیشہ، دروازے کے شیشے کے داغ کی اور حیثیت ہے۔ عینک کے شیشے کے داغ کی اور حیثیت ہے، یہاں چھوٹا بھی بڑا لگتا ہے وہاں بڑے نشان پر بھی گزرا ہوا جاتا ہے۔ ہم جیسے وہ شیشہ رکھتے ہیں جو شیشہ ہے کسی شوکیس کا، جو شیشہ ہے کسی دروازے کا، اور نبی علیہ السلام کے تقوے کا وہ شیشہ ہے جو آنکھ کے شیشے سے بھی کروڑ درجہ لطیف ہے، لہذا وہاں پر معمولی سے نقش و نگار کو بھی اپنی شایان نہیں سمجھتے، اُس کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف ہم ہیں، ہمارا رب کے دربار میں حضوری کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود نقش و نگار میں لگے ہوئے ہماری حیثیت اور طرح کی ہے اور سرکار کا قرب اور طرح کا

ہے۔ اب جس وقت سوچا اور غور و فکر، تدبر و فکر کیا تو اَلْهَتَنِی سے سرکار کی فضیلت کا پتا چلا، سرکار کی عظمت کا پتا چلا۔ اب لفظ یہی ہیں لیکن اس کو دوسرا طبقہ (معاذ اللہ) سرکار کو عام سا انسان سمجھنے کے لیے واضح کر رہا تھا۔ لیکن حق والوں نے پڑھا تو پتا چلا کہ یہاں تو خاص الخاص مقام کی بات ہو رہی ہے۔

[۹] استغفار کا معنی کرنے میں ہوش:

رسول اکرم ﷺ توبہ و استغفار کی اہمیت کو بیان کر رہے تھے کہ توبہ و استغفار کرنی چاہیے تو آپ نے لفظ کیا ارشاد فرمائے۔ رسول اکرم ﷺ ارشاد فرمانے لگے:

إِنَّهُ لِيَعَانُ عَلَى قَلْبِي۔ میرے دل پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔

وَأَنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةً مَرَّةً۔

(مسلم شریف باب الاستجاب الاستغفار والاسئد رمضہ حدیث نمبر ۴۸۷۰)

”میں دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں۔“ ایک انداز اس کو ظاہری طور پر سمجھنے کا ہے۔ جنہوں نے بخاری کا ترجمہ بغل میں رکھا ہوا ہے اور دین کی دانش کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں، لوگوں سے کہیں گے لوگو! دیکھو اس نبی کو سو مرتبہ دن میں استغفار کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ (معاذ اللہ) پھر کہتے ہیں کہ کوئی گناہ تھا تب ہی مغفرت کر رہے ہیں۔ (معاذ اللہ)

ورنہ اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ کیسے کہتے۔ یہ اس لیے ہے کہ دل پہ گناہوں کے پردے پڑ گئے ہیں۔ (معاذ اللہ) یہ سوچ گستاخانہ سوچ ہے۔ جو اسے سہارا بنا کر اپنے مطلب اور دھندلے کو پورا کرنا چاہتے ہیں، لیکن جس وقت صحابہ کرام سے پوچھو گے، تابعین سے پوچھو گے، تبع تابعین سے پوچھو گے، نہیں تو پنجاب کے داتا صاحب سے پوچھو گے تو پتا چلے گا یہاں تو سرکار کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے۔

آج کل کالجوں، یونیورسٹیوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ آنے کے بعض پروفیسر ایسی باتیں اُٹھائے پھرتے ہیں۔ اُن کو پتا ہی نہیں کہ منصب نبوت ہے کیا اور ہم بول کس کے بارے میں رہے ہیں، یہ تقریریں اور لیکچر ہو رہے ہیں کہ دیکھو دن میں سو بار توبہ کرتے تھے۔ توبہ سے پہلے گناہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو معاذ اللہ دن میں کئی گناہ ہو جاتے تھے۔ پھر توبہ کرتے تھے۔ یہ تقریریں اسکولوں اور کالجوں میں کی جا رہی ہیں، کچھ ہوس پرست پروفیسر و استاذ جو مختلف باطل پرستوں کے ایجنٹ ہیں اور ہماری ملت کے بیٹوں کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ سُنو! اگر تم نے حدیث سمجھنی ہے تو داتا علی ہجویری علیہ الرحمۃ کی ویلیز پہ جانا پڑے گا، داتا صاحب بیان کریں گے:

”یہ شان رسالت ہے ذرا ہوش سے بول۔“

تھڑے پہ بیٹھے ہوئے، فیکٹری میں بیٹھے ہوئے ایک عام انسان کو داتا صاحب سمجھا رہے ہیں کہ یہ شان رسالت ہے، کسی چھوٹے بندے کی بات نہیں ہے۔ یہاں پر جس جہت سے دیکھو گے تو عظمت کا ایک نیا جہان نظر آئے گا۔

کشف المحجوب میں داتا علی ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

توبہ کی اقسام:

”توبہ برسہ گونہ باشد۔“ توبہ کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: ”یکی از خطا با صواب۔“ ایک توبہ ہے کہ غلطی سے توبہ کر کے صحیح کام کرنا۔

یعنی خطا کو چھوڑنے کی توبہ کرنا۔

دوسری قسم: ”یکے از صواب با صواب۔“ دوسری توبہ ہے کہ درست کو چھوڑ کے درست کرنا۔

یعنی ایک درست کو چھوڑا ہے تو دوسرا درست شروع کر دیا ہے۔

پہلی قسم یہ تھی کہ غلطی چھوڑ کر درست کام شروع کیا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ درست کو ہی چھوڑ کر درست کام شروع کر دیا۔

تیسری قسم کون سی ہے: ”از خودی خود بحق تعالیٰ۔“ اپنے خیال سے توبہ کر کے رب کے خیال میں ڈوب جانا، یعنی اپنی خودی سے توبہ کر کے، اپنے آپ سے توبہ کر کے، اپنے خیال سے توبہ کر کے، اپنی ذات کی فکر سے توبہ کر کے اپنے رب کے جلوؤں میں مست ہو جانا۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان تین قسموں پر دلیل دی ہے۔ قرآن سے بھی اور حدیث سے بھی۔

یہ صوفی ہوتا ہے جو اتنے بڑے علم کا خزانہ ہوتا ہے۔ اتنا بڑا قرآن و سنت کا ماہر ہوتا ہے، اتنا بڑا مفکر اور محدث ہوتا ہے وہ کہ جو لفظ زمانے میں حجاب اکبر بن رہے ہوں، اُن الفاظ سے حجاب کو دور کر کے علم کا صحیح چہرہ دکھاتے ہیں۔ اب جو کہہ رہے تھے کہ کوئی گناہ ہے تو پھر توبہ کی ہے۔ وہاں علم پردہ بن گیا اور حجاب بن گیا۔ یہ داتا صاحب کی روحانیت ہے کہ علم والے حجاب کو دور کر کے حقیقی علم کا چراغاں کرنے والے ہیں۔

توبہ کی پہلی قسم: ”از خطا با صواب۔“ خطا سے توبہ کر کے صواب کی طرف آنا۔

مثال: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ - (سورة آل عمران آیت نمبر ۱۳۵)

وہ لوگ جو کوئی فحش کام کر بیٹھیں یا اپنے اوپر ظلم کر بیٹھیں تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اب یہاں پر توبہ کس بارے میں استعمال ہوا کہ غلطی کو چھوڑنا اور درست کام کرنا۔

توبہ کی دوسری قسم: ”از صواب با صواب۔“ صواب سے صواب کی طرف توبہ کرنا۔

مثال: حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تھے۔

جب آریٰ فی کہا تو جواب لَئِنْ تَرَانِیْ کی صورت میں ملا۔

ایک جلوہ اللہ نے طور پر گرایا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر زمین پہ گر پڑے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس وقت انہیں ہوش آیا تو کیا بولے:

تُبَدِّلُ الْإِیَّاتِ - (سورة الاعراف آیت: ۱۳۳) اے اللہ میں نے توبہ کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ کا جو لفظ بولا، داتا صاحب فرماتے ہیں: از صواب با صواب یہ وہ غلطی سے توبہ نہیں تھی، یہ ایک درست کام سے توبہ تھی۔ درست سے درست کی طرف توبہ تھی۔

اس کا کیا مطلب بنا، داتا صاحب فرمانے لگے: ہمہ عالم اندر حسرت رُویت خداوند اند

ساری دُنیا اللہ کے جلوؤں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ موسیٰ ازاں توبہ کرو

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام توبہ کر گئے کہ میں اب آریٰ فی نہیں کہوں گا۔ اے اللہ مجھے دیدار

عطا کر دے اب میں یہ نہیں کہوں گا۔ جس کو سارا جہان ڈھونڈھتا ہے اُس بات سے توبہ کر رہے ہیں وہ غلطی نہیں تھی لیکن اُس کو چھوڑا کیوں ہے۔

چھوڑا اس لیے ہے کہ اے اللہ مجھے پتا چل گیا کہ دوستی میں اپنا اختیار برتنا جائز نہیں ہے۔

جب تو نے مجھے اپنا بنایا ہے تو مجھے چاہیے تھا باقی ہر کام جب میں نے تیری مرضی سے چھوڑا ہے تو

دیدار والا کام بھی تیری مرضی سے چھوڑ دوں: ”مرضی ہے دیدار کرا، مرضی ہے تو دیدار نہ کرا۔“

تو جو پہلی حالت تھی کہ میں نے دیدار مانگا تھا اُس سے تائب ہو گیا ہوں۔ اب کبھی دیدار

نہیں مانگوں گا یہ تیری مرضی ہے کہ تو کب اپنا دیدار کرائے گا۔

قرآن میں تَبَدُّل کا لفظ تو آگیا مگر وہ غلطی سے توبہ نہیں بلکہ درست سے توبہ ہے، ایک

درست کام سے دوسرے درست کام کی طرف جانے کا نام توبہ ہے۔

داتا صاحب فرماتے ہیں کہ: دیکھ لو گناہ کوئی نہیں لیکن توبہ کا لفظ موجود ہے۔

توبہ کی تیسری قسم: ”از خودی خود بحق۔“ اپنے آپ سے توبہ کر کے رب کے دیدار میں ڈوبتے رہنا۔ یہ تیسری توبہ ہے اس کا مرتبہ دوسری قسم سے بھی بڑا ہے۔ تو مطلب یہ بنے گا:

إِنَّهُ لَبِغَانٌ عَلَى قَلْبِي۔

میرے رب اُمّت کی بھی سوچتا ہوں، اُس وقت تیری طرف خیال نہیں ہوتا، اُمّت کی سوچ تیرے حکم سے ہے مگر ہے تو مخلوق کی سوچ اُمّت کی بہتری کے لیے سوچتا ہوں، اُمّت کے مسائل سنتا ہوں اُن کو جواب دیتا ہوں، اُمّت کے مستقبل کے لیے پلاننگ کرتا ہوں، اُمّت کی قیامت تک کی مشکلیں حل کرنے کے لیے سوچتا ہوں تو یہ وہ پردہ ہے جس سے خیال اُمّت کی طرف چلا جاتا ہے۔

وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةً مَرَّةً۔

تو میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں کہ جب اپنے خیال میں اور اُمّت کے خیال میں ہوتا ہوں پھر اس کو ترک کر کے اللہ کے خیال میں چلا جاتا ہوں۔

پہلے نہ کوئی صغیرہ گناہ ہے نہ کبیرہ گناہ ہے، نہ کوئی بھول ہے، نہ کوئی چھوٹی موٹی خطا ہے، پہلے بھی بڑا مرتبہ تھا، جو رب نے اُمّت کی فکر عطا فرمائی ہے، پھر اس کو سوا بار چھوڑ کے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سوا بار داخل ہو جاتا ہوں۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس کی وضاحت کرتے ہوئے خوب صورت انداز میں کہتے ہیں: ”محال باشد کہ خواص از معصیت توبہ کنند۔“

یہ محال ہے کہ اللہ کے خاص بندے گناہ سے توبہ کر رہے ہوں، وہاں گناہ نہیں ہے۔ وہاں ایک صواب سے دوسرے صواب کی طرف یا اپنی خودی سے حق کی طرف لوٹنا یہ توبہ ہے۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ بڑا ہی قابلِ غور ہے:

”چنانکہ مقاماتِ مصطفیٰ علیہ السلام ہر برتر ترقی بود۔“

یہ سُنو! بلاوجہ نہیں دُنیا داتا کا نعرے لگاتی، وہ جنہوں نے خاکِ پنجاب میں سجدوں کے بیج بوئے تھے اور آج یہ گلشن میں بہار آئی ہے، اُس داتا صاحب کی تعلیمات قرآن و سُنّت کو سمجھنے کے لیے کتنی ضروری ہیں۔ یہ جو حدیث میں سوا بار توبہ کا یا ستر بار توبہ کا لفظ آگیا کہ میں استغفار کرتا ہوں۔

تو فرمانے لگے، ظالمو! یہ نہ سمجھنا کہ کوئی کبیرہ یا کوئی صغیرہ گناہ، یا کوئی چھوٹا گناہ تھا یا کوئی بڑا

گناہ تھا۔ فرمانے لگے: توبہ گناہوں سے نہیں کی جا رہی۔ توبہ اُمت کے خیال سے فارغ ہو کر اللہ کے دربار کی طرف متوجہ ہونے کو کہا جا رہا ہے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”چنانکہ مقامات علیہ السلام ہر دم بترقی بود۔“

کہ ہمارے نبی علیہ السلام کے مقامات ہر وقت ترقی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر: جس وقت آپ نے اعلان نبوت کیا تو اُس وقت اربوں مقامات مل چکے

تھے۔ اگلے منٹ میں اللہ نے ایک اور مقام دیا اُس سے اگلے منٹ میں اللہ نے اور مقام دیا۔

یہ ہمارے نبی علیہ السلام کی شان ہے کہ ہر منٹ میں مقام بڑھایا جا رہا ہے:

”چوں بر مقام بر ترقی رسید۔“ جب مزید اونچے مقام پر چلے جاتے۔

”ضرورتی استغفار می کند از مقام ضرورت استغفار فی کرد۔“

جب اونچے درجے پر پہنچے تو پہلے درجے سے استغفار کرنے لگے۔

جو پہلے مقام تھا اُس سے استغفار کرنے لگے: ”توبہ بجا نیاور۔“ یہ توبہ کا انداز ہے۔

کوئی بندہ اس حدیث کو آڑ بنا کے کوئی رسول اکرم ﷺ کے ذمے گناہ نہ تھوپتا پھرے اور

اُن کی طرف گناہوں کو منسوب نہ کرے، وہاں گناہ نام کی کوئی چیز نہیں، جہاں کلیم کا مقام ہے، گناہ تو

وہاں ہی ختم ہو گئے تھے، وہاں بھی صواب سے صواب کی طرف توبہ ہے۔ ہمارے رسول اکرم

ﷺ کا اگلا مقام ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ بلند مقام دیتا ہے اور مزید بلند درجے پہ پہنچ جاتے

ہیں، اپنے چھوٹے درجے سے توبہ کرتے ہوئے بڑے درجے کا سفر شروع فرمادیتے ہیں۔

[۱۰] بے ہوش کا مواخذہ:

جس وقت ایک انسان شان رسالت کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے تو اُسے کیا ملتا ہے اور اگر نہیں رکھتا

تو اُس کا بگڑتا کیا ہے، اُسے کیا ہوتا ہے؟

رسول اکرم ﷺ ایک انسان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اُس کا نام قیس بن

ابی خازم تھا۔ رسول اکرم ﷺ کا انداز یہ تھا کہ آپ جس بیمار کے پاس بھی جاتے، تو فرماتے:

لَا بَأْسَ ظَهَرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى۔ کوئی حرج نہیں اس سے تو گناہ جھڑ جائیں گے۔

جس بیمار کی بھی عیادت کرتے تو یہ جملہ بولتے تھے۔ طہور کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیماری

تمہارے گناہ جھاڑنے آئی ہے۔

اس سے بیمار کو حوصلہ مل جاتا اور سرکار کے لفظوں میں بڑی تاثیر تھی، بندہ صحیح ہو جاتا۔

لَا بَأْسَ۔ کوئی حرج نہیں، کوئی پرالہم نہیں، مسئلہ ہی کوئی نہیں۔

ظَهَرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى۔ اس سے سارے گناہ جھڑ جائیں گے۔

ایک بد وقیس بن ابی خازم کو جب آپ نے جا کر یہ فرمایا تو وہ عجیب آدمی تھا، اسے پتا نہیں

تھا کہ شان رسالت کے بارے میں کیسے بولنا ہے۔ آگے سے وہ بد و بول پڑا:

هِيَ حُمَى تَفُورُ عَلَى شَيْخٍ كَبِيرٍ۔ (بخاری شریف، باب علامات النبوة، حدیث ۳۳۴، ج ۱، ص ۵۱۱)

یہ تو بخار ہے، جو جوش مار رہا ہے۔

بوڑھا مرنے کو تیار ہے، تم کہتے ہو اس میں حرج کوئی نہیں ہے۔ میں مر رہا ہوں، بخار جوش

پر ہے اور آپ فرماتے ہیں: لَا بَأْسَ۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

جب وہ یوں بولا تو میرے آقا علیہ السلام آگے سے بول پڑے: فَتَعَمَّرْ إِذَا۔

ٹھیک ہے، اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی ہے۔ پھر کیا ہو اور دوسرے دن اسی بخار سے وہ مر گیا۔

رسول اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا اگر وہ قبول کر لیتا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ نے

کہا ہے: لَا بَأْسَ۔ کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے سرکار آپ نے فرمادیا۔

لیکن وہ بخار سے تنگ تھا، کہنے لگا بوڑھے کو قبر نظر آ رہی ہے۔ تم کہتے ہو کوئی حرج ہی نہیں

ہے: نَعَمَّ إِذَا۔ اگر تو ایسے کہتا ہے، تو پھر ایسے ہی سہی۔

شان رسالت کا جو تقاضا تھا وہ پیش نظر نہ رکھا گیا۔ تو اُس کی فوراً گرفت ہو گئی۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ایک نصرانی نے کلمہ پڑھا، جس وقت اُس نے کلمہ پڑھا تو نبی علیہ

السلام نے اُسے بڑا نوازا اور کاتب وحی بنا دیا۔

اُس نے ”سورۃ آل عمران“ لکھی اور ”سورۃ بقرۃ“ بھی لکھی۔ مگر کچھ لوگوں کو ہیضہ ہو جاتا

ہے۔ کہنے لگا: مَا يَدْرِي مُحَمَّدٌ إِلَّا مَا كَتَبْتُ لَهُ۔ جو میں لکھتا ہوں اس نبی کو وہ ہی آتا ہے۔

اُسے یہ پتا نہیں کہ تمہیں لکھنے کا مقام کس نے دیا ہے اور لکھواتا کون ہے۔ کہتا ہے جو میں

لکھتا ہوں وہی یہ جانتے ہیں۔

وہ عیسائی ہو کر مر گیا۔ عیسائیوں نے اُس کو دفن کیا۔

لَفْظَتَهُ الْأَرْضُ۔ زمیں نے اُگل کر باہر پھینک دیا۔

صبح جب عیسائیوں نے دیکھا تو وہ باہر پڑا تھا۔

هَذَا فَعَلَ مُحَمَّدٌ وَأَصْحَابُهُ - (بخاری شریف باب علامات النبوة، حدیث ۵۱۱/۱، ۳۳۴۸)

دُشمنوں نے کہا کہ حضرت محمد ﷺ اور اُن کے صحابہ نے باہر نکالا۔ یہ اُن کو چھوڑ کر آیا ہے۔ لہذا انہوں نے اسے قبر سے باہر نکال دیا ہے۔ حالاں کہ سرکار کے صحابہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے قبر کو مزید گہرا کیا، شام کو دفن کر کے چلے گئے۔ صبح آئے تو پھر وہ باہر پڑا تھا۔ پھر انہوں نے کہا کہ یہ نبی علیہ السلام کے صحابہ ہیں جو یہ حرکت کر رہے ہیں۔ تیسری بار بہت گہری قبر کھودی اور اُس کو دفن کر کے چلے گئے، صبح کے وقت آئے تو دیکھا وہ باہر پڑا تھا۔ اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ مرد و گندہ اتنا ہے کہ زمین اس کو پسند نہیں کرتی۔ وہ بڑے بڑے مجرموں کو قبول کر لیتی ہے۔ مگر اس نے جو بکواس کی تھی کہ: جو میں لکھتا ہوں وہ ہی نبی کو آتا ہے، ان کو اپنے طور پر کچھ نہیں آتا۔

اس گستاخ کے اس جملے کی وجہ سے اور تو اور رہا؛ اب زمین نے بھی اُس کو جگہ نہ دی۔ زمین بھی اُس کو اُگلتی اور پھینکی رہی کہ اس کو بولتے وقت یہ ہوش نہیں آیا کہ:

”یہ شانِ رسالت ہے، میں کس کے بارے میں بول رہا ہوں؟“

آج بھی ایسے واقعات ہو رہے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے یہ بتا دیا گیا کہ: جو مقام میں نے محبوب کو دیا ہے اُن کے بارے میں بولتو ہزار بار سوچ کو غسل دو پھر اُن کے بارے میں بات کرو۔ [۱۱] ہوش مندوں کا انعام:

اگر ادب سے بولیں گے تو کیا ملے گا؟ ایک چیونٹی کو چیونٹیوں کی امامت ملی۔ اُس کا کام کیا تھا۔ اُس کو یہ شان کیسے ملی؟ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر آ رہا تھا تو ایک چیونٹی دوسری چیونٹیوں سے کہنے لگی:

يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ - اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں داخل ہو جاؤ۔

لَا يَحْطَبَنَّكُمْ سُلَيْمَنُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ - (سورۃ النمل، آیت ۱۸)

کہیں ایسا نہ ہو کہ عدم تو جب کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور اُن کے لشکر کے نیچے تم روندی جاؤ اس واسطے اپنی اپنی بلوں میں داخل ہو جاؤ۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے اُس چیونٹی کو دیگر چیونٹیوں کی ملکہ بنایا۔

اُس کو یہ مقام کیسے ملا؟ کہتے ہیں کہ اُس چیونٹی نے ادب نبوت ظاہر کیا تھا۔ کیوں؟

اُس نے عصمتِ پیغمبر کا عقیدہ بیان کیا: وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ۔

کہنے لگیں چیونٹیو! ویسے نہیں ہو سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے ہوئے تم پہ قدم رکھیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ہاں بے خبری میں قافلہ ہے اور لشکر ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ کی اس طرف توجہ نہ ہو۔ تو تم اُن کے قدموں کے نیچے آ جاؤ۔

اپنی سوچ کا اُس چیونٹی نے اظہار کیا کہ اللہ کا نبی گنہگار نہیں ہوتا اور اللہ کا نبی ظالم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کی ستھری سوچ کو دیکھ کر اُس کو چیونٹیوں کی سردار بنا دیا۔

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور جادو گروں کا آپس میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ مگر جادو گروں کو کلمہ نصیب ہو گیا۔ وہ کلمہ پڑھ گئے۔ اس کا سبب کیا بنا؟ یہاں پر بھی امام رازی نے اپنی تفسیر میں صوفیوں کا قول لکھا، اس کا سبب یہ بنا تھا کہ:

جس وقت آپس میں آمنے سامنے آئے تو جادو گروں سے ایک نیکی ہو گئی۔ نبی کا ادب ہو گیا۔ اللہ کے نبی کا تھوڑا سا ادب کر بیٹھے، اُس ادب نے اُن کا بیڑہ پار کر دیا۔ حالاں کہ وہ بڑے بد بخت اور مجرم تھے۔ اللہ کے دشمن فرعون کے مہمان تھے۔ اُس کو حق ثابت کرنا چاہتے تھے مگر بولتے وقت شانِ نبوت کا تھوڑا سا لحاظ کیا۔ کچھ ادب کر بیٹھے، اللہ نے اُن کو کلمے کی توفیق عطا فرمادی۔ انہوں نے کہا تھا:

يُمُوسَىٰ إِنَّمَا أَنْ تُلْقِيَ وَإِنَّمَا أَنْ تَكُونَ فُحْنُ الْمَلِئِكِينَ - (سورۃ الاعراف، آیت ۱۱۵)

اے کلیم مرضی تمہاری ہے یا تو آپ پھینکیں یا ہم پھینکتے ہیں۔

اس میں اللہ کے نبی کا ذکر پہلے کیا، اے کلیم یا آپ اپنا عصا پہلے پھینکیں یا ہم رسیاں پھینکتے ہیں، اُن سے اللہ کے نبی کا ادب ہو گیا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ: اللہ کے نبی کا نام جو انہوں نے پہلے ذکر کیا تھا اور یہ کہا کہ پہلی باری چاہو تم لے لو یا ہمیں دے دو۔ چوں کہ انھوں نے پیش کش کر دی تھی، اللہ کے نبی کو مقدم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کا کفر نکال کر اُن کو ایمان عطا فرمادیا۔ نبوت کے لحاظ سے یہ آداب ہیں۔

جو شخص ان رستوں پہ چلتا ہے۔ اُس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، جو اُکڑتا ہے تو اُس کے لیے ہر لمحہ نافرادیاں ہوتی ہیں۔ اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے ہر بندہ اس کا مبلغ ہونا چاہیے، یہ پیغام ہے جس کو تم آگے پہنچاؤ۔

میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو شانِ رسالت ہر وقت پیش نظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین) ♦♦♦